تحریر: ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ
ترجمہ: سید ہاشمی فرید آبادی

اسلام اور مسیحیت: کچھ فرق، کچھ یکسانیاں
ایک تقابلی مطالعہ مذاہب

ایک طرف تو سرسری طور پر دیکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے درمیان فرق بھی ہیں اور بعض اعتبار سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت بھی رکھتے ہیں، اور دوسری طرف نہایت باریک بیں اہل علم تک اس فرق و مماثلت کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرنی چاہیں، تو مشکل میں پڑجاتے ہیں۔ عام طور پر وہ چیزیں جو سرسری نظر میں مطابق معلوم ہوتی تھیں، عجیب عجیب اور پیچ در پیچ طریقوں سے بالکل مختلف ثابت ہوتی ہیں۔ دو مذہبوں کی احتیاط سے جس قدر تنقیح کی جائے، اسی قدر زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ مماثلات صرف قریبی ہیں، قطعی نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ کلی اصول سے جتنی زیادہ آدمی کو واقفیت ہوتی جاتی ہے، اسی نسبت سے وہ یہ ماننے پر زیادہ مائل ہوتا ہے کہ جزئیات میں کتنا ہی اختلاف ہو اور وہ تحقیق سے بڑھتا ہی چلا جائے، کچھ نہ کچھ واقعی اور بنیادی، اگرچہ مبہم مماثلت ضرور موجود ہے اور شاید مزید علم و فہم سے وہ بھی بڑھتی جاتی ہے۔ درختوں کو جتنے زیادہ غور سے دیکھئے، ان میں ایک دوسرے سے اور زیادہ فرق عیاں ہوگا، لیکن اس بنا پر اگر آپ بھول جائیں کہ انہی کا یہ جنگل ہے، تو یہ آپ کے مطالعے کی کوتاہی ہوگی۔

یہ مسئلہ علمی اور عملی دونوں قسم کے مصالح رکھتا ہے۔ عملی میدان میں اگر ہمارا قدم آگے بڑھ سکے تو مختلف رسم و روایات کے لوگوں میں ارتباط باہمی کی راہ نکل سکتی ہے اور زمانہ حاضر کی ایک شدید ضرورت پورا کرنے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ ماضی میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی باہمی حفاظت عموماً بے نتیجہ رہی ہے جس کے متعدد سبب تھے، اور انہی میں ایک سبب یہ تھا کہ صاف طور پر یہی بات مشکل سے واضح ہوتی تھی کہ ان میں تصفیہ طلب امور کون سے ہیں؟ اگر دو نظام کلی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، تو ان میں باہمی گفتگو نہیں ہو سکتی، لیکن اگر فرق جزوی ہے، جیسا کہ ہم باور کرتے ہیں تو فرق اور یکسانی کو الگ الگ کردینے کے

بعد ایسی مکالمت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ اگر دو قومیں یہ جان لیں کہ کن باتوں میں وہ متفق ہیں اور کن میں اختلاف رکھتی ہیں' تو وہ اپنے اپنے موقف کے متعلق سمجھ کر بحث و گفتگو کر سکتی ہیں' لیکن اگر ایک دوسرے کے مسلک ہی کے بارے میں غلط خیال رکھتی ہیں اور اپنے اصلی فرق اور یکسانی ہی کو کچھ کا کچھ سمجھ رہی ہیں' تو پھر ان میں باہم گفتگو ہو بھی تو وہ یاس انگیز' لایعنی اور کم سے کم بے نتیجہ ہی رہے گی۔ افسوس ہے کہ تاریخی واقعہ بھی زیادہ تر یہی ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگوں نے ایک دوسرے سے بات ہی نہیں کی اور اگر کی تو وہ ایک دوسرے سے گویا اتنے ملاقی نہیں ہوئے جتنے کہ پاس سے گزر کر چلے گئے ہیں۔

خالص علمی میدان میں آیئے تو ہمارا خیال ہے کہ یہاں یہ بحث "تقابل مذاہب" کے سلسلے میں اٹھائی جاتی ہے جو نسبتاً" جدید شعبہ علم ہے۔ ایسے خالص علم کے مقاصد میں یہ بات شامل نہیں ہوتی کہ براہ راست عملی مسائل سے واسطہ رکھا جائے' لیکن اس قسم کی ذہنیت مہیا کرنا ضرور اس کے مقاصد میں داخل ہے جو ہمارے عملی مسائل کو حل کرنے میں مدد دے۔ آج ہمارے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مذہبی اقوام کے درمیان ارتباط و دوستی کی راہیں کس طرح وسیع کی جائیں؟ اس مقصد کی اخلاقی قدر و قیمت کا تو غالباً" یہ تقاضا نہیں ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی شعبہ اس کا بیڑا اٹھائے اور سچ پوچھیے تو یہ مقصد پورا کرنے کے لیے جیسے مخلصانہ جذبات درکار ہیں' وہ خود مذہب والوں کو فراہم کرنے چاہییں' نہ کہ اس علم کے پڑھنے پڑھانے والوں کو' تاہم یہ کام اخلاص اور نیک نیتی کے علاوہ نئی اور صاف مفاہمت بھی چاہتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جسے اہل علم اور شاید صرف اہل علم ہی مہیا کر سکتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ مہیا کریں۔ کسی کھاڑی پر پل بنانے کا فیصلہ تو ضرورت مند کاروباری کرتا ہے اور اس کی تعمیر معمار و مزدور کے ہاتھ سے ہوتی ہے' لیکن وہ اصول اور پیائش کے تناسب جن کے مطابق پل کے تخیل کو عملی صورت دی جائے اور وہ مضبوطی سے تعمیر کر دیا جائے' یہ علم ہندسہ کے ماہروں کا کام ہے اور ان سے بھی پہلے علوم طبیعی کے جاننے والوں کا - اسی بنا پر ہمیں یقین ہے کہ ہمارے زمانے میں مختلف مذاہب کو ایک دوسرے کے لیے قابل فہم بنانے کے واسطے جس قسم کے علمی تجزیے اور تصورات درکار ہیں' وہ مذاہب کے تقابلی مطالعہ کرنے والوں کو بہم پہنچانے ہوں گے[۱]۔ بے شبہ یہ اس شعبہ علم کے فرائض میں ایک ضروری فریضہ ہے کہ ہمیں جو کچھ بتائے' وہ کم سے کم دو مذہبوں کی حقیقت کو وقت واحد میں ہمارے سامنے آشکار کرتا ہو۔ پھر' ہماری رائے میں یہ بات محض اخلاقیات کی

۱ - عالم اسلام اور عیسائیت' اپریل - جون ۱۹۹۸ء

تحقیق ہی کے لیے ضروری نہیں ہے' بلکہ اس علم کی کامیابی کا مدار بھی اس پر ہے کہ اپنے نظریات کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھے۔ بہ الفاظ دیگر' اس تقابلی علم کی محض درسی ضرورت بھی اسی وقت ثابت ہو سکتی ہے جب کہ وہ مذکورہ بالا مقصد کے قریب آجائے۔ کسی بیان کی علمی صحت جانچنے کی ایک صورت یہ ہے کہ' مثلاً" بدھ مذہب کے بارے میں جو کچھ کہا گیا' وہ نہ صرف پر معنی ہے' بلکہ بدھ مذہب کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں' دونوں کے لیے لائق تسلیم اور دل کش بھی ہے۔ ہمارا ایک سیدھا سادہ موقف تو یہ ہو سکتا ہے کہ صرف ایسی بات کہیں جو علمی روایت اور بدھ مذہب والوں' دونوں میں مقبول ثابت ہو۔ لیکن مطالعے کی دوسری منزل اتنی آسان نہیں ہے' جہاں ہمیں دو مذہبوں کے متعلق تقابلی بیان دینا ہے اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ وہ دونوں کے دل نشین ہو اور اسی کے ساتھ علمی مزاج سے پوری مطابقت رکھتا ہو اور اس مزاج کے لیے ظاہر ہے کہ علمی صحت اور صداقت کی پابندی ناگریز ہوگی۔ تحقیقات کی یہی دوسری صورت یہاں ہمارے پیش نظر ہے۔

اس مقالے میں خصوصیت کے ساتھ ہمیں مسیحیت اور اسلام پر غور کرنا ہے۔ یہ موضوع صریحاً" نہایت وسیع ہے' لیکن ہم نے خیال کیا کہ اس کے چند جزوی پہلوؤں پر نظر ڈالنا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ مسلمان' عیسائی اور مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والے' تینوں ہی گروہ صراحت کرتے یا دل میں محسوس کرتے ہیں کہ یہ دو مذہب اگرچہ واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں' مگر ان میں مناسبت بھی ضرور ہے۔ ہم یہ بات زور دے کر کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ابتدائی سطح پر جو مناسبتیں نکالی جاتی ہیں' تحقیق کی اگلی منزلوں میں وہ اتنی صحیح نہیں ثابت ہوتیں جتنا کہ عام طور پر فرض کر لیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم یہ بھی جتا دینا چاہتے ہیں کہ یکسانیاں جو یقیناً" موجود ہیں' ممکن ہے کہ ایسے گوشوں میں برآمد ہوں جن کی طرف نظر ہی نہیں گئی تھی۔ مطلب یہ کہ اگر یکسانی کے پہلو بعد میں غور کرنے سے ایک دوسرے کے خلاف رخ کرتے پائے جاتے ہیں تو ایسے پہلو بھی موجود ہیں جو بادی النظر میں مختلف ہیں' لیکن دوسری' تیسری یا چوتھی بار غور کرنے سے ان میں کوئی غیر متوقع اشتراک نکل آتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کو شروع ہی سے ایک سیدھے سادے سے مغالطے میں پڑنے سے بچنا چاہیے اور وہ یہ مفروضہ ہے کہ مختلف مذاہب ایک ہی سے سوالات کا جواب مختلف دیتے ہیں۔ مگر ہماری رائے یہ ہے کہ درحقیقت یہ فرق بہت کچھ اس وجہ

سے پڑگیا ہے کہ سوالات ہی کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ اس سے بھی آگے نفیس تر سطح پر آکے غور کیجے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ "مذہب" کوئی محسوس مادی چیز نہیں ہے۔ عالم تو ایک ہے اور وہ فوق الادراک ہستی بھی یقیناً" واحد ہے جس کے لیے اس عالم سے تعلق کے بارے میں یہ عالمی مخلوق یعنی انسان سوال کرتا ہے' لیکن یہ سوالات مختلف مذہبی روایات کے مطابق ہی اس کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایک خداشناس کے نزدیک' خدا ہی اپنے بندوں کو جس حال میں پاتا ہے' ان کی حدود اور مذہبی اشکال کے مطابق ان سے الگ الگ معاملہ رکھتا ہے' اگرچہ وہ خود کثرت یا دوئی سے پاک ہے۔

مسیحیت اور اسلام کے تقابل کرنے میں سب سے پہلے ان کی آسمانی کتابوں پر نظر جاتی ہے۔ ایک مذہب کے پاس "بائبل" ہے دوسرے کے پاس قرآن مجید۔ پھر ان کے بانی' ایک حضرت مسیح علیہ السلام دوسرے (سرور کائنات) محمد (مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ ایک مذہب میں گرجا ہوتے ہیں' دوسرے میں مسجدیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ مماثل چیزیں بدیہی تو ہیں' لیکن مزید تفتیش کیجے تو ان میں اتنی یکسانی نہیں پائی جائے گی' بلکہ ممکن ہے یہ محض تشبیہی اور آخر میں مغالطہ آمیز ثابت ہو۔ ہم نے بارہا ان معاملات میں ایسی سیدھی سادی مساوات کی صحت پر اعتراض کیے ہیں۲' لیکن اپنے مطالعے میں وسعت پیدا کرنے اور اس مسئلے کو زیادہ روشن کرنے کی غرض سے یہ معلوم ہوا کہ ان مماثلات کو ایک جائزہ میں جمع کردیا جائے۔ چنانچہ اس مقالے میں انھیں جمع کیا' پھیلایا اور ان پر غور کیا گیا ہے۔

ہم بحث کا آغاز ایک ایسے مسئلے سے کرتے ہیں جو نسبتاً" سیدھا اور صاف ہے' کیونکہ بنیادی طور پر لفظی ہے۔ اگرچہ غلط فہمی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ یہ جملہ ہے: "خدا کی مرضی" کہ عیسائی اور مسلمان دونوں اسے بولتے ہیں' مگر اس سے ان کے ذہن میں مختلف معنی آتے ہیں۔ مسیحی اپنی سب سے عام ماثورہ دعا میں' جس کی تعلیم خود حضرت مسیح نے انہیں دی' کہتے ہیں "تیری مرضی پوری ہو۔" اس کا تعلق ان کی اس آرزو سے ہوتا ہے کہ دنیاوی امور ایک بلند تر نمونے' یعنی خدا کی آنے والی سلطنت' کے مطابق انجام پائیں۔ یہ جملہ نہایت گہرے معنی رکھتا ہے اور اس "مرضی الٰہی" میں گہرے اخلاقی تصورات موجود ہیں۔ مرضی الٰہی بجا لانے کی جدوجہد انسان کا سب سے اونچا مقصد اور وظیفہ ہے' اور اس کی انتہائی ناکامی بھی اسی میں مضمر ہے۔ اس تصور کا اسلامی جوڑ مذہبی اصطلاح "رضائے الٰہی" (:رضوان' مرضی) ہوگا۔ زیادہ مطابقت لانے

کے سلسلے میں شاید ہم یہ جسارت کرسکتے ہیں کہ مسیحیت کی "مرضی الٰہی" کو اسلام کی شریعت (یا مذہبی قانون) کے مماثل قرار دیں۔ شاید یہ بھدی بات ہے' لیکن مخدوش نہیں ہے' کیونکہ ان کی عدم مماثلت پر ہر شخص کی نظر جاسکتی ہے اور اسی کے ساتھ ہم گزارش کریں گے کہ شاید ان کی جزوی مماثلت بھی بعض حضرات کو نظر آجائے۔

اللہ کی مرضی (مشیت' ارادہ) اسلام میں آدمی کے بجالانے کی چیز نہیں' بلکہ خدا کا اپنا فعل ہے۔ یہ ناگزیر طور پر عمل کرتی ہے۔ اس کی دعا کرنا مہمل بات ہے' کیونکہ وہ شدنی اور اٹل ہے' اور فی الواقع اس میں گستاخی نہیں تو حماقت کا پہلو ہے کہ آدمی کی نسبت کہا جائے کہ وہ مرضی الٰہی کو عمل میں لائے۔ یہاں یہ اخلاقی نہیں' بلکہ تقدیری تصور ہے۔ کبھی کبھی مسیحی بھی "مرضی" کو مبہم طور پر ان معنی میں بولتے ہیں۳' لیکن عموماً "امر" اور مشیت الٰہی سے جو سوال پیدا ہوتے ہیں' انہیں عیسائی حلقوں میں خدا کے علم ازلی کی محبت (نیز قضا و قدر' اور اختیارات کامل) کے سلسلے میں لایا جاتا ہے۔ مرضی الٰہی وہ ہے جو واقع ہوا اور امر یا حکم الٰہی وہ (جو انسانی زبان میں) ہونا واجب ہو۔ انسان اس حکم کی نافرمانی کر سکتا ہے' لیکن مرضی الٰہی سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

سب سے عمومی معنی میں جیسا کہ ہم نے اوپر اختیار کیے ہیں' مسیحیوں کے جملے "تیری مرضی پوری ہو" کے مترادف (اسم مصدری کی صورت میں) خود لفظ "اسلام" ۴ ہے۔ مسلم کی تعریف یہ ہے کہ وہ خدائی احکام کو زمین پر (جیسا کہ مسیحیوں کے عقیدے میں آسمان پر بھی) نافذ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ دنیا میں بھی اسی کی (یعنی سیاسی اعتبار سے اسلامی) بادشاہی قائم ہو۔ ایک' الفاظ کے معنی میں جو تاریخی تبدیلیاں ہوئی ہیں' ان میں یہاں ابہام کی مماثل صورت بھی ہے کہ ابتداء میں تو "اسلام" کا مفہوم خدا کے حکم ("امر") کی عملی اطاعت یا اسی حکم کی دل و جان سے متابعت قبول کرنا تھا' لیکن آگے چل کے یہ اس کی مشیت کے آگے سرجھکانا اور راضی برضا رہ جانا ہو گیا۵۔ اس تبدیلی کا مسلمانوں کے مذہب و ثقافت کا قریبی صدیوں میں زوال کے ساتھ تعلق باہمی کا پتہ چلانا دلچسپی سے خالی نہیں۔ ممکن ہے کہ مسیحی الہیات میں جس طرح فعالیت سے انفعالیت آئی' مذکورہ تبدیلی اس کی مماثل مثال ہو۔

آیئے! اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز نظیروں پر توجہ کریں۔ یہ دعویٰ کہ اسلام میں قرآن کا مرتبہ وہی ہے جو مسیحیت میں بائبل کا' کوئی لایعنی بات نہیں ہے۔ اسے بہت لوگ مانتے ہیں اور

اس کی ابتدائی درجے میں مشابہت قابل قبول ہے' لیکن گہری نظر سے جانچیے تو یہ معاملے کا محض سرسری حل ثابت ہوگا۔ بہ خلاف اس کے ہم عرض کرتے ہیں کہ دوسرے یا اونچے درجے کی مشابہت یہ دعویٰ ہوگا کہ قرآن کا اسلام میں مرتبہ وہ ہے جو دین مسیحی میں خود حضرت مسیح کی ذات کا ہے۔ یہ دعویٰ اپنی اندرونی مشکلات سے خالی نہیں' تاہم خالص مذہبی معنی میں کچھ زیادہ ہی قابل قبول ہے۔ اس سلسلے میں مزید مماثلات جو ہم نے وضع کی ہیں وہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلوۃ والسلام) اور سینٹ پال' اور دوسرے حدیث اور بائبل کی مما ثلتیں ہیں -- ہماری حجت یہ ہوگی کہ اسلامی آئین کی رو سے وحی الٰہی کا اصلی مرکزہ قرآن ہے۔ وہی نوع انسان کو خدا کا عطیہ اور مذہب کا قلب ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ شخص ہیں جنہوں نے یہ پیام نوع انسان کو پہنچایا' اس کی اور اس کے مضمرات کی تلقین و تعلیم دی اور جنہوں نے اسے خدائی قانون کے طور پر مانا' ان لوگوں کی امت کی تنظیم کی۔ اسی امت نے رفتہ رفتہ ان کتابوں کا ایک مجموعہ تیار کیا جن سے اس پیام الٰہی کی عملی تعبیر' تشریح اور ترسیل "سنت نبوی" کی صورت میں ہوتی ہے۔ اب غور سے دیکھیے تو صاف ظاہر ہوگا کہ اس نظام کے تین عنصر قرآن' پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حدیث' مسیحیت میں اپنا قریب ترین مماثل مسیح علیہ السلام' سینٹ پال (یا بارہ حواری' عربی صیغہ واحد میں "رسول" بھی کہتے ہیں' غالباً" عام طور سے بہ شمول سینٹ پال) اور تیسرا "بائبل (یا زیادہ خصوصیت کے ساتھ "عہدنامہ جدید") رکھتے ہیں۔ عیسائیوں کی بائبل وحی الٰہی نہیں' صرف اس کی تحریری شہادت ہے۔ اس رائے کی صداقت غالباً" مسیحی اہل فکر نے حالیہ سنین میں اچھی طرح سمجھی' ورنہ ہمیشہ سے صاف نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ مسلمانوں کی غلط تعبیر پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام "انجیل لائے" (قرآن' سورۃ الحدید : ۲۷)۶۔ اسے عیسائی اور مذہب کی تاریخ لکھنے والے غلطی ہی سمجھیں گے اور غلطی بھی ایسی کہ عیسائی اس پر ہنسیں گے اور بعض احتجاج کریں گے۔ بہرحال یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ قرآن اور عہد نامہ جدید یا موجودہ اناجیل اربعہ میں اگر آخر الذکر کو وحی یا کتاب اللہ مان لیا جائے (جیسا کہ مسلمان اور بعض عیسائی بھی نا سمجھی سے فرض کرلیتے ہیں) تو مماثلت قرار دینے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ بخلاف اس کے عہدنامہ جدید خصوصاً" چار انجیلوں اور حدیث کا نہایت متوازی ہونا' غور کرنے سے بخوبی آشکار ہو جائے گا۔ مسلمانوں کا یہ کہنا کہ عیسیٰ علیہ السلام انجیل لائے' ایسی بات ہے جیسے عیسائی کہنے لگیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صحیحین یا صحاح ستہ لائے تھے۔

چونکہ اس بارے میں ہم دوسرے مقام پر لکھ چکے ہیں ۷۔ یہاں ان کی مزید تفصیل نہیں کرتے۔ اگرچہ ان کے مضمرات کافی اہم اور دوررس ہیں۔ مثالاً" دونوں مذہبوں میں نجات ایمان پر مبنی ہے' یعنی خدا اور وحی (یا رسالت) پر یقین لانے پر۔ مسلمانوں میں ایمان وہ ہے جو محمد(صلی اللہ علیہ وسلم) لائے اور یہ صرف کتاب نہیں' بلکہ اس کے احکام ہیں؛ کیونکہ قرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصولاً" عمل کرنے کی ہدایات ہیں۔ ان پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اس اخلاقی تعلیم کا عملاً" بھی پابند ہونا قبول کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر (جیسا کہ آگے صراحت آتی ہے) قانون اور قوم یا امت کی تشکیل ہوئی' کیونکہ یہ قانون قوم یا معاشرے پر بھی حاوی ہے۔ اس کے مقابلے میں مسیحی ایمان سے مراد خدا اور مسیح علیہ السلام پر ایمان لانا ہے' یعنی "مسیح علیہ السلام میں سما کر زندگی گزارنا" اور اسی کی مطابقت میں دین یا کلیسا میں حصہ دار ہونا بھی مضمر ہے۔ اس طرح موازنے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے جسے ہم نے دوسری جگہ واضح کیا ہے۸۔ وہ یہ کہ اسلام میں بندے اور خدا کے درمیان وسیلہ یا واسطہ (عیسائیوں کی زبان میں) تقویٰ ہے۔ یہودی مذہب پر بھی یہ قول صادق آتا ہے (اور قدیم ترسامی مذاہب تک پر)۔ اسی بناء پر سینٹ پال زور دیتا ہے کہ "ابراہیم کا ایمان' اس کو تقویٰ سے شمار کرایا گیا" (کتاب تکوین' ۶:۱۵' رومتر' ۳:۴)' لیکن اگر عیسائی اس کا مطلب یہ سمجھیں کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے گناہ گاروں کو نجات حاصل ہوگی' قانون کی وساطت سے حاصل نہ ہوگی تو یہ ان کی غلطی ہے ۔ اسلام میں کم سے کم حقوق عباد کی حد تک نجات کا مدار تقویٰ اور نیکی پر ضرور ہے' لیکن ذاتی طور پر تقویٰ پر ایمان لانا باعث نجات ہے' لہٰذا وہ گناہ گاروں کو بھی حاصل ہوسکتی ہے۹۔

اسی سے' ہماری' ایک اور موازنے کی طرف رہ نمائی ہوتی ہے جو بدیہی اور معیاری رہا ہے اور اسے دہرانا بے سود نہ ہوگا۔ وہ ہے: مسیحیت اور اسلام میں فلسفہ الٰہیات نے کیا حصہ لیا؟ اس موازنے کی یقیناً" گنجائش ہے' لیکن ہم کسے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس باب میں بھی سطحی مماثلت تسلیم کیے جانے کا اندیشہ ہے۔ عیسائیوں میں یہ علم بہت قدیم سے مرکزی رہا ہے' لہٰذا وہ ممکن ہے فرض کر لیں کہ دوسرے مذاہب میں بھی اصل عقیدہ اور الٰہیات کی تاویلات کو یہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ واقعتاً" وہ بعض اوقات دوسرے لوگوں کے مذہب کی نسبت ان الفاظ میں سوال کیا کرتے ہیں کہ "وہ لوگ کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟" حالانکہ مذہب کی اصلی نہایت' بلکہ ابتدائی حقیقت کے بارے میں بھی (مثلاً" مصر' جدید پولی نیشیا) یہ سوال کافی نہیں ہے اور

اس میں ایک اور الجھن اس لیے پیدا ہو جاتی ہے کہ "عقیدے" کو بالکل جداگانہ شے "ایمان" کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ خاص خاص وجوہ سے، جن میں ابتدائی مسیحیت پر قدیم یونان کے اثرات اور یورپ کی تہذیب میں ان کے قومی عناصر سب سے اہم ہیں، الہیات کا مسیحی مذہب میں بہت دخل رہا اور ابھی تک نافذ ہے۔ ایمانیات کو علمی زبان میں بیان کرنا بہت لوگوں کے نزدیک ان کی سب سے ممتاز صورت ہے۔ ملت اسلامی میں سرے سے ایسا نہیں مانا جاتا۔ اسلام کی احتیاط سے تحقیق کرنے والے برگ اسٹراسر کے قول کی صداقت تسلیم کیے بغیر نہ رہیں گے کہ اسلام میں دین کی قطعی تعبیر شریعت یا قانون ہے۱۰۔ یہ بات اس درجے تک جاتی ہے کہ ہم دعویٰ کریں گے کہ بعض اعتبارات سے اسلام میں شریعت کا وہی رتبہ قرار دینا درست ہوگا جو عیسائیوں میں الہیات کو دیا جاتا ہے۱۱۔ مسیحی اہل علم کو بعض دفعہ سخت حیرت ہوئی جب پہلی دفعہ ان کو معلوم ہوا کہ بعض ممتاز مسلمان علمائے مذہب الہیات کو لائق مطالعہ نہیں سمجھتے، بلکہ دماغی انتشار یا لوگوں کی مشیخت پر محمول کرتے ہیں۔ اس موازنہ و مماثلت کی تکمیل کے لیے ہم یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں الہیات یا "علم کلام" کا وہ مرتبہ ہے جو عیسائیوں میں فلسفہ مذہب کا، کہ جنہیں شوق ہو ان کے لیے وہ ایک عمیق اور اکثر نہایت درخشاں علم ہے جو مذہب کی وکالت کرنے میں مفید ہو سکتا ہے، لیکن اصل مذہب کے دائرے سے باہر بلکہ مشکوک چیز ہے جسے ترک کر سکتے ہیں۔

یہی حال اس بدیہی مماثلت کا ہے کہ اسلام میں مسجد کا وہی مقام ہے جو عیسائیوں میں گرجا کا۔ ابتدائی موازنے میں تو یہ رائے بے شک درست ہے، لیکن زیادہ احتیاط سے تعمق کیا جائے تو مسجد گرجا کے تسبیح خانے (CHAPEL= حجرۂ عبادت) کا جواب نکلے گی، کیونکہ وہ مذہبی ادارہ نہیں بلکہ زیادہ تر عبادت گاہ ہوتی ہے۔ مسیحی گرجا (چرچ) کی امتیازی نوعیت کا قدیم تاریخی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت کے ظہور کے وقت یہود میں جماعت کی رسمی تلقین کے علاوہ حجرے میں الگ عبادت کرنے کا دستور ہو گیا تھا، یہی حجرہ آگے چل کر صومعہ بنا۔ بظاہر عیسائیوں نے اس کی تقلید کی اور ان کا گرجا ان دونوں کے عناصر کا مجموعہ ہوگیا۔ اسلام کسی پیر پروہت کا قائل نہیں اور اس میں عوام کے لیے ہیکل یا اجتماعی تعلیم گاہ کا جداگانہ مقام کبھی نہیں بنایا گیا۔ اس کلیے سے صرف "حرمین" کو شاید مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔ (خود یہ اصطلاح معنی خیز ہے اور مکہ و مدینہ کی ان مسجدوں کے سوا دوسرے شہروں کی مسجدیں اصطلاحی معنی میں متبرک عمارتیں یا حرم

نہیں ہیں)۔

اس موضوع کو آگے لے چلیں تو "گرجا" یا کلیسا کے یہ معنی کہ وہ ایک مقامی عمارت ہوتا ہے جہاں لوگ (نماز کے لیے) جمع ہوتے ہیں' استخراجی سمجھیے' ورنہ اصل معنی لوگوں کی جماعت یا گروہ کے ہیں جس میں نظری یا تمنائی اعتبار سے تمام عیسائی ملت شامل ہو۔ واقعتہ" بھی یہ مقامی جماعت کی نماز کا مقام ہونے سے وسیع تر معنی میں مستعمل ہے جیسے کلیسائے قدیم (آرتھوڈکس چرچ)' کلیسائے انگلستان وغیرہ۔ مقامی گرجا کی عمارت کو گویا اس نام (نہ کہ چیپل یا عبادت خانہ) سے اس لیے موسوم کرتے ہیں کہ وہ اس وسیع ملت کی رسمی منظوری سے بنا ہے۔ ایک مسیحی کسی گرجا یا کلیسا کا رکن (= ممبر) ہوتا ہے۔ مسلمان کسی مسجد کا اس طرح کا رکن نہیں ہوتا۔ ایک معنی میں یہ قول صحیح ہے' مگر ایک اور اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چند پہلوؤں سے اسلام کے صوفی سلسلے عیسائیوں کے کلیساؤں' خصوصا" مختلف پروٹسٹنٹ کلیساؤں یا مذہبی فرقوں سے مماثلت رکھتے ہیں۔ پس چند شرائط کے ساتھ ہم یہ خیال پیش کر سکتے ہیں کہ ہماری مماثلت کی فی الوقت تکمیل اس طرح ہوگی کہ اسلام میں مسجد تو مسیحیت کے چیپل (عبادت خانے) کی مثل ہے اور طریقہ (یا زاویہ یا اس طرح کا صوفی فرقہ) مسلمانوں میں وہی مقام رکھتا ہے جو عیسائیوں میں کلیسا کا ہے۔ اب اگر اس دوسرے یا اونچے درجے کی مماثلت کو درست مان لیا جائے (اور ہمارے نزدیک اس کی کسی حد تک تائید نہ صرف مذہبی' بلکہ معاشری وجوہ سے بھی ہوتی ہے) تو ہمیں یہ بھی فورا" نظر آئے گا' بلکہ ہم اصرار کریں گے کہ مماثلت کا یہ درجہ بھی شافی نہیں' بلکہ اس کی مزید چھان بین تیسرے اور چوتھے درجہ اعلیٰ کی طالب ہے۱۲۔ چنانچہ پہلی نمایاں مشکلات میں ایک دشواری یہ سامنے آئے گی کہ کسی مسلمان کے لیے کسی طریقہ صوفیہ میں شامل (= رکن) ہونا ضروری نہیں' اگرچہ بہت سے مسلمان شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ہیئت کے اعتبار سے ہمیں اپنی مماثلت کو کسی ایسی تنظیم کی طرف لے جانا ہوگا جیسی وائی-ایم-سی-اے ہے کہ اس میں شرکت ضمنی اور اختیاری چیز ہوتی ہے (اگرچہ ظاہر ہے کہ دیگر اعتبار سے اس میں اور اسلامی مسجد میں مماثلت نہیں ہے۔)

ایک اور میدان بھی ہمارے خیال میں تلاش کی دعوت دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا اسلامی "ہدیٰ" (= ہدایت) وہی مفہوم رکھتا ہے جو مسیحیت میں "روح مقدس" (= ہولی اسپرٹ' روح القدس) کو حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا' مسلمانوں کو فلسفہ الٰہیات سے زیادہ شغف نہیں رہا اور

انہوں نے ہدایت الٰہی کے عقیدے کی بھی تفسیر و تعبیر پر چنداں توجہ نہیں کی' خصوصاً" اس الٰہی ہدایت کی جوامت مسلمہ کو خدا کی طرف سے ملتی ہے' تاہم علم کلام میں نہیں توفقہ کے عقیدہ "اجماع" میں اس اعتقاد کا ثبوت ملتا ہے کہ خدائے تعالیٰ کا انسان کو ہدایت کرنے کا عمل نبی کی صریح وحی پر ختم اور محدود نہیں ہوا۔ اس کی رحمت اور الطاف جو انسانوں کو اپنے تقرب کا راستہ دکھاتے ہیں' اگرچہ ان کے طریق ہدایت کی تکمیل اور اتمام تاریخی طور پر نزول قرآن کی صورت میں ہو چکا ہے' لیکن عملی طور پر ان کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

حقیقت میں "اسپرٹ" کا مسیحی تصور مسلمانوں میں خدا کی صفت "الہادی" سے زیادہ قریبی مماثلت رکھتا ہے' بہ نسبت ان معنی کے جو لفظ "روح" سے وابستہ ہیں۔ اسی سے ہمیں ایک اور مماثلت یاد آئی جو دیر سے ہمارا دل گد گداتی رہی ہے۔ بے شک یہ پوری طرح ہم جنس نہیں اور کچھ ہیجان انگیز معلوم ہوگی' تاہم ہمیں تو غور کے لیے خاصی کارآمد نظر آتی ہے کہ مسیحی فلسفے کی تثلیث اور مسلمانوں کے نود و نہ اسمائے الٰہی میں مماثلت نکالی جائے۔ ان میں معنوی یکسانی ایسی نہیں جیسی باہمی تعلق کی صورت میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ ہم نے ایک مرتبہ یہ موازنہ ایک روشن خیال مسلمان کے سامنے پیش کیا جو ادبیات میں لندن سے ڈاکٹری کا سند یافتہ تھا۔ اس کی شدید ناگواری اور فوری تردید دیکھنے کے قابل تھی' مگر ہمیں کچھ بہت موثر نہیں معلوم ہوئی۔ اصل میں مسلمانوں کو عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث سے قدیم سے ایسی بے زاری چلی آتی ہے کہ وہ آسانی سے اس بات پر غور تک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ آیا مسلمانوں نے خدا سے تعلق کی بحث میں اس کی صفات کو جس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے' ان میں کوئی مشابہت عیسائیوں کی اسی میدان میں سعی کے ساتھ پائی جاتی ہے یا نہیں؟ تاہم ہمیں معلوم ہوا کہ ٹھیک انہیں یکسانیوں پر نہایت سنجیدہ اور طولانی بحث حال میں فی الواقع شائع ہوئی ہے ۱۳۔

یہ شاندار جملہ "لاہوولا وغیرہ"۱۴ (وہ خدا نہیں اور نہ غیر اس سے جدا ہیں) بڑی خوبصورتی سے اور بلا ترمیم تثلیث کے دوسرے اور تیسرے اقنوم یا افراد کے انہی معنی پر چسپاں کیا جاسکتا ہے جو ان کے بارے میں اکثر (عیسائیوں) کا جدید تصور ہے۔

اسی طرح متعدد دائرے ہیں جن میں اس قسم کے سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ تسلیم شدہ مماثلات پر غور کیا جاسکتا ہے اور زیادہ باریک نئی مماثلتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ہم اس بیان کو ایک دلیرانہ قیاس پر' جو یقیناً" ہیجان انگیز ہے' ختم کریں گے۔ اگرچہ شاید یہ عیسائی اور مسلمان

دونوں کو خفا کر دے اور تقابلی مذہب کا مطالعہ کرنے والے اسے نشانہ تضحیک بنائیں۔ پھر بھی ہم اسے پیش کرتے ہیں اور اس کا سبب یہ نہیں کہ ہم اسے لازماً صحیح سمجھتے ہیں' بلکہ یہ کہ وہ لائق توجہ اور بنفسہ سبق آموز ہے اور اسی کے ساتھ اس قسم کے مشغلے میں جو دشواریاں اور مضمرات ہیں' انہیں خاص طور چبھتے ہوئے پیرائے میں سامنے لانا ہے۔ ہم اسے ایک سوال کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک عیسائی کے ذہن میں "عشائے ربانی" کی اہمیت اس اہمیت کے مماثل ہے جو ایک مسلمان کے لیے قرآن حفظ کرنے میں ہے؟

مجموعی طور پر قرینہ یہی ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ پھر بھی شاید دو ایک ایسے پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے میں مضائقہ نہیں جو اثباتی جواب کے حق میں پیش کیے جاسکتے ہیں اور اس سے بھی اہم تر بات شاید یہ ہے کہ بعض ایسی وجوہ بھی خیال میں آتی ہیں کہ اس سوال کا کوئی جواب دیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ آخری امکان بھی بجائے خود خاص وزن ووقعت رکھتا ہے۔ ہم نے یہ سوال خود اپنے ذہن میں بھی کیوں اٹھایا' اس کا ایک مقدم سبب وہ قیاسی مماثلت ہوئی جو ہم نے اوپر نکالی ہے۔ پھر اس کی قوت بعد کے مطالعے اور مسلمان اور عیسائی دونوں مذہب کے حضرات سے گفتگو کرنے سے پوری شدت کے ساتھ ہم نے محسوس کی' جب کہ مسیح علیہ السلام اور قرآن کا مقام اور ان دو کے درمیان موازنہ پیش نظر تھا۔ یہی وہ مقام ہیں جہاں عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت میں اور مسلمان قرآن کی شکل میں خدائی کو انسانوں کی دنیائے دنی میں دخیل و نافذ ہوتا دیکھتے ہیں۔ قرآن مجید جو مسلمہ عقیدے کی رو سے ازلی اور غیر مخلوق ہے' مسلمانوں کی نظر میں اس عالم فطرت کی وہ فوق الفطرت مگر موجود اور بدیہی چیز ہے جو ازلی ہونے کے باوجود دنیائے زماں میں نازل ہوا ہے۔ قرآن سے ظاہر ہے کہ "کاغذ اور سیاہی" مراد نہیں' بلکہ اس کا مافیہ' اس کا پیام' اس کے کلمات اور بالاخر اس کے معنی مراد ہیں۱۵۔ حافظ (عام طور پر "یاد کرنے والا"' لیکن لغوی اعتبار سے زیادہ صحیح "محفوظ کرنے والا") ایک لحاظ سے قرآن کو اپنا بنالیتا یا اپنے وجود میں اس طرح جذب کرلیتا ہے جس سے ایک مسیحی کے ذہن میں کچھ مشابہت اس حالت سے ہوجاتی ہے جو عشائے ربانی کی دعا کے وقت ایک عیسائی تصور کرتا ہے کہ اس نے مسیح علیہ السلام کے جسم کو اپنا بنا لیا۔ اور مسیحی علیہ السلام اس موقع پر خدائی کا دنیوی اظہار' فوق الفطرت فطری حقیقت' لازمانی کی زمانی شکل ہوتے ہیں۔

اتنی بات تو ہر شخص مشاہدہ کرسکتا ہے کہ حافظ قرآن کی جو لوگوں میں عزت کی جاتی ہے اور

خود حافظ کے حق میں اس کام کی جو اہمیت ہوتی ہے' وہ محض اس کے ذہن کی خوبی پر مبنی نہیں ہوتی۔ قصائد سبع معلقات کو حفظ کر لینے اور قرآن کے حفظ کرنے کے مرتبے میں بہت فرق ہے۔ قرآن کے حفظ کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ گویا خدا کے عطیے کو اس کتاب اور کاغذ سے جن میں وہ ملفوف تھا' نکال کر اپنے وجود کے اندر شامل کر لیا گیا۔ اس طرح کہ اب وہ حافظ کی زندگی کے ساتھ' اس کی جیتی جاگتی' ذاتی غیر منقولہ ملکیت ہوگیا۔

مگر اس بحث کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اصل دعوے کے درست یا مضحکہ انگیز ہونے سے قطع نظر' سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے کس طرح جان سکتے ہیں؟ ایک مسیحی کی "عشائے ربانی" کی دلی کیفیات اور ایک مسلمان کے حفظ قرآن کے محسوسات کا مقابلہ کرنے کی کیا صورت ہے۔ مسلمان سے پوچھیے تو وہ "عشائے ربانی" کے مالہ وماعلیہ سے ہی واقف نہیں' وہ کیا بتائے۔ مسیحی' حفظ قرآن کی رسم (اگر یہ لفظ یہاں بولنا درست ہو) کی اہمیت ہی نہیں سمجھتا۔ سچ پوچھیے تو دونوں گروہ خود اپنی کیفیات یا مشاہدات قلبی تقابلی مطالعہ کرنے والوں کو سمجھانے سے قاصر ہیں' کجاکہ دوسروں کے مشاہدات و محسوسات کی تشخیص کرسکیں۔ مذاہب کا تقابلی طالب علم یہاں تجریدی یا غیر مادی چیزوں کی تحقیقات کررہا ہے' لیکن وہ اتنی باریک اور ناقابل بیان ہیں کہ فی الواقع وہ اکثر بڑی گومگو کی حالت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ مذہبی آدمی کسی بیرونی شخص کو "عشائے ربانی" یا اسی طرح کے موقع پر جو روحانی کیفیت ہوتی ہے اس کی اہمیت نہیں سمجھا سکتا' مگر ہمارے نزدیک خود یہ دشواری ایسی عجیب اور توجہ طلب ہے کہ ہم نے زیر بحث سوال اٹھانا جائز خیال کیا۔ اگرچہ ہم نے جس مماثلت کو پیش کیا ہے' غور کرنے سے خود ہم ہی یہ پوری طرح نہیں باور کرتے کہ واقعی یہ ایسی مماثلت ہے جیسی شروع میں ہمیں نظر آئی تھی۔ بایں ہمہ اتنا ہم ضرور محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ مزید تحقیق و جستجو کے لائق ہے۔ اگر دونوں فریق کی کتابوں کی اچھی طرح چھان بین کی جائے اور دونوں مذاہب کے لوگوں سے مل کر گفتگو کی جائے اور علمی حقائق کی ان سے تشریح سنی جائے' اگرچہ یہ شرح اصل متن کو نظر سے مستور کرنے والی نہ ہونی چاہیے' تو پھر ممکن ہے تقابلی مذاہب کا ایک حساس اور تربیت یافتہ طالب علم اس قابل ہو کہ ہم نے جو سوال اٹھایا ہے' اس کا کوئی مستند جواب دے سکے۔ بے شبہ' اس وقت تک خود ہم اس بارے میں کافی تحقیقات نہیں کرسکے ہیں۔

خلاصہ کلام کے طور پر ہم یہ بھی گزارش کریں گے کہ ہم نے جو مماثلتیں' علی ہذامغائرت کی

مثالیں لکھی ہیں' وہ ایسی بڑی مماثلت یا مغائرت کی نہیں ہیں' جیسی بادی النظر میں شاید معلوم ہوں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے خاص خاص اجزاء میں جو مشابہتیں ہیں' وہ سب فقط ملتی جلتی چیزیں ہیں' انہیں یکساں اور بالکل مطابق کہنا درست نہ ہوگا۔ اوراگر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر احتیاط سے تقابلی مطالعہ بھی کہیں زیادہ نتیجہ خیز ہوگا۔

حقیقت میں بعض اوقات تو آدمی سوچنے لگتا ہے کہ کیا آخر میں ایمان ایک ایسی قطعی شخصی چیز ثابت نہیں ہوتا' جس کی حقیقت ہر مذہب کے افراد (یا کم سے کم جماعتوں) کے اندر یکساں ہے؟ اب اگر ظاہری صورت کی بجائے اصلی معنی پر کوئی غور کرے (اور بغیر اس کے مذہب کی تحقیق بے معنی بات ہوگی) تو اسے کامل خبرداری کے ساتھ قدم بڑھانا چاہیے اور تیار رہنا چاہیے کہ اسے ایسے ایسے گوشوں سے مدد مل سکتی ہے جن کا پہلے خیال تک نہیں آیا تھا۔

حواشی

۱۔ نیز ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "اسلام ان موڈرن ہسٹری" (پرنسٹن' ۱۹۵۷ء)

۲۔ دیکھیے: "اسلام ان موڈرن ہسٹری" خصوصاً حواشی ۱۱' ۱۳' ۲۷' ۲۸ باب اول

۳۔ چنانچہ "تیری مرضی پوری ہو" بعض اوقات اپنے بے دست و پا ہونے یا تسلیم و رضا کے اظہار کے موقع پر بولتے ہیں' لیکن ایسا دعا میں یا کوئی کام شروع کرتے وقت نہیں کہتے' بلکہ کوئی واقعہ ہو جانے کے بعد استعمال ہوتا ہے۔ جس کی مثال یہ ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کے مرنے پر پکارے یا اسے ایسا کہنے کی ہدایت کی جائے کہ "تیری مرضی پوری ہو" مطلب یہ کہ تیری مرضی سے ایسا ہوا' مجھے قبول ہے' یہ اب اس عقیدے پر مبنی ہوا کہ جو کچھ ہوتا ہے' لامحالہ مرضی الٰہی سے ہوتا ہے۔ ان معنی کو اپنے عقیدے سے مطابقت دینے میں کہ خدا وہی کرتا ہے یا مرضی رکھتا ہے جو بہتر ہوتا ہے' بہت سے مسیحی علماء اور بہت سی ماؤں کو الجھن ہوتی رہتی ہے۔ یہی عقیدہ اسلام میں موجود ہے اور سچ پوچھیے تو اسی جوڑ کا سوال دنیا کے دوسرے فلسفوں میں جیسے مارکسی نظریہ یا دوسرے خالص دنیوی نظریات جو جبریت کے قائل ہیں' اخلاقی نہیں تو علمی حیثیت سے ان میں بھی پایا جاتا ہے۔

۴۔ لفظ "اسلام" کے معنی "تیری مرضی پوری ہو" کیے جاسکتے ہیں "(امریکی ایوان نیابت میں اڈاہو کے کانگریسی نائب جون وڈکا قول۔ تاریخ ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء منقول "دی مسلم سن رائز" جلد

۲۴' شمارہ آخری سہ ماہی ۱۹۵۲ء' بحوالہ روداد کانگرس' جلد ۴۸' ص ۱۸) (معلوم نہیں یہ عبارت انہوں نے کس ماخذ سے لی ہے۔)

۵۔ ا سمتھ' کتاب مذکور' حاشیہ ۱' صفحات ۱۶۔۱۷

۶۔ قرآن میں یہ بات جابجا واضح کردی گئی ہے کہ انجیل سے اس کی مراد وہ اصلی وحی ہے جو خدا نے عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی' نہ کہ مختلف اناجیل جواب "عہد نامہ جدید" کے نام سے عیسائیوں میں متداول اور غلط روایات سے بھری ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کی حالیہ اور سابقہ تفاسیر' نیز تراجم میں اسے پوری طرح واضح کردیا گیا ہے۔ مثالاً" دیکھیے : تفسیر سید رشید رضا (طبع مصر ۱۳۲۴ھ' جلد ۳' ص ۵۹)' حقانی (لاہور' ۱۳۶۴ھ' جلد ۴' ص ۴۶)' انگریزی ترجمہ عبداللہ یوسف علی (لاہور ۱۹۳۷ء۔ ضمیمہ "انجیل") تفسیر ماجدی (لاہور ۱۹۵۲ء' جلد ۱' ص ۱۲۲ وغیرہ) مترجم

۷۔ ا سمتھ' کتاب مذکور' ص ۱۷

۸۔ ا سمتھ' کتاب مذکور' ص ۱۷

۹۔ ا سمتھ' کتاب مذکور' ص ۱۹۔ (عبارت واضح نہیں ہے اور غالبا لائق مقالہ نگار اسلامی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھ سکا ہے۔ (مترجم)

۱۰۔ مثالاً" اے - آر - گب' "محمڈنزم" (لندن' ۱۹۴۹ء)' ص ۱۰۶

۱۱۔ ا سمتھ' کتاب مذکور' ۱۰

۱۲۔ "چرچ" کو مذہبی فرقے کی بجائے وسیع ترین معنی میں لیا جائے تو وہ ایک ہمہ گیر' ربانی اور انسانی مشترکہ شان کی اصطلاح بن کر پوری مسیحی ملت پر حاوی ہوجائے گا اور اس معنی میں اسلامی "امہ" کا مترادف ہو جائے گا۔ یہ بجائے خود صحیح ہے' لیکن پھر بھی ناکافی ہوگا کیونکہ جیسا سب جانتے ہیں' مسلمانوں میں امہ ان معنی پر بھی محیط ہے جس کے لیے عیسائیوں میں معاشرہ یا ملک کے الفاظ آتے ہیں۔ اس سلسلے میں لفظ "جماعہ" کے معانی پر غور کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۳۔ اس مقالے کا عنوان ہے:

The Muslim Attributes and the Christian Trinty بقلم اے وولف سن' ہارورڈ تھیولوجیکل ریویو (جنوری ۱۹۵۶ء)

۱۴۔ "شرح --- التفتازانی علی العقائد النسفیہ" (قاہرہ' احیاء الکتب العربیہ' بلا تاریخ' ص ۷۰)

۱۵۔ قرآن "کلام" الٰہی ہے ۔ "وہ خدا نہیں ہے نہ وہ خدا سے الگ (=غیر) ہے۔" ہم یہ نہیں کہتے کہ الفاظ و حروف ازلی ہیں --- (غیر مخلوق) قرآن یا اللہ کا کلام' نہ قلوب میں مقیم ہے نہ زبانوں میں' نہ کانوں میں۔ وہ ایک ازلی تخیل (یا مفہوم) میں جو اللہ کی ذات میں باقی اور موجود ہے۔ عقائد نسفی کی شرح از سعدالدین تفتازانی' ترجمہ انگریزی ارل - ای - ایلڈر (نیو یارک' ۱۹۵۰ء)'ص ۶۲